علیگ

● علیگ میں چھپنے والے تمام مواد کیلئے ادارہ ذمہ دار ہے۔
● ہر مہینہ کی ۱۰ اور ۲۵ کو شائع ہوتا ہے۔

ششماہی ایک روپیہ
فی پرچہ ۲؍

جلد ۱	۲۵ دسمبر ۱۹۵۶ء	نمبر ۸

کھوکھلے اِنسان

ہم سب ایک بڑے انسانی سماج کا حصہ ہیں۔ اس میں فرداً فرداً ہمارا ایک اجتماعی رول ہے، اور حسب توفیق ہمیں ایک بہتر سماج کی تخلیق میں یہ رول ادا کرنا ہے۔ ہم سب پہلے اپنا ایک انفرادی کردار بناتے ہیں، اسکے بعد اجتماعی کردار کی باری آتی ہے اور یہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ ہمارے انفرادی کردار میں کتنا ٹھوس پن ہے۔ تعلیمی تربیت کا اگر کوئی بڑا مقصد ہے تو یہی شخصیت کی تعمیر اور انفرادی کردار میں ٹھوس پن پیدا کرنا۔

شخصی کردار کے کتنے ہی ناسور ہیں۔ جو رس رس کر سارے سماج کو گندہ کر دیتے ہیں، اور ان ناسوروں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے 'کاروباری پن' جو شخصیت کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ انسان بالکل کھوکھلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بات چیت، اخلاق، وفاداری، دوستوں اور ساتھیوں سے برتاؤ، غرض سب کچھ کاروباری ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کاروباری اخلاق کے بل پر ایسا شخص دوسروں سے کسقدر ممتاز ہونا چاہتا ہے اور وہ عارضی طور سے اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اس قسم کے لوگ ایک اور بیماری کا شکار ہوتے ہیں، وہ بیماری ہے خود مرکزیت (Self Centredness)۔ اسے خود غرضی سے ذرا اونچی چیز سمجھ لیجئے۔ ایسا شخص جب بھی گفتگو کرے گا اپنے متعلق اور جب بھی کچھ سوچے گا اپنے بارے میں، اسکی ساری دنیا وہ خود ہوتا ہے، وہ صرف اپنی ذات میں جلوۂ حق کے مشاہدہ کا قائل ہوتا ہے۔ ایسے افراد اپنی زندگی کامیابی سے گزار لیتے ہیں لیکن اپنے اس اجتماعی رول کو ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو ٹھوس انفرادی کردار کی دین ہے۔

یونیورسٹی میں جہاں اور بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں وہاں ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مختلف Types of Men اسٹڈی کرنے کو مل جاتے ہیں اور اس اسٹڈی سے اگر کوئی سنجیدگی کے ساتھ کچھ نتائج اخذ کرے تو یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد زندگی بعض بیش قیمت تجربات کی روشنی میں زیادہ سلیقہ مندی سے گزر سکتی ہے۔ یہاں جن Human Species سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے ہمارے پورے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔

عبد الحمید عدمؔ نے غالباً جیسی کسی شخصیت ہی پر یہ شعر کہا ہے

> دوستی ان سے ہو گئی ہے عدمؔ — جنکی ہر بات کاروباری ہے

کھوکھلی شخصیت کے بناوٹی انسان اسی یونیورسٹی کے طلباء میں آپ کو بڑی تعداد میں مل جائینگے اور قصور ان کا نہیں ان کے تجربہ اور تربیت کا ہوتا ہے۔ انھوں نے اکثر دیکھا ہوتا ہے کہ ان کے سامنے دوسروں نے اسی کاروباری اخلاق کی بدولت وہ کچھ پا لیا جس کے وہ ساری عمر میں مستحق ہوتے۔ اتنا کچھ پانے کے لئے اگر کچھ کھو بھی دیا جائے تو سودا مہنگا نہیں۔ شروع شروع میں اپنے کھوکھلے پن کے احساس سے انھیں تکلیف بھی ہوتی ہے لیکن ہوتے ہوتے احساس زیاں مر جاتا ہے اور کھوکھلی شخصیت پر بالکل ایک نیا خول چڑھ جاتا ہے۔

اسی لئے علی گڑھ میں آپکو یار، پارٹنر بہت سے مل جائیں گے، دوست کوئی نہیں ملے گا۔ شاید علی گڑھ سے باہر بھی آج کی دنیا میں پارٹنر بہت ہیں، دوست بہت کم۔ یہاں ظاہری ہمدردی مل جائے گی، خلوص کا کہیں پتہ نہیں۔ ایک ہی راہ کے راہی ہونے کے ناتے عارضی رفاقت مل جائے گی، محبت کہیں نہیں ——— محبت اور خلوص! کاش کھوکھلے انسان ان دو بے جان لفظوں سے کچھ سیکھ سکتے۔

"اعلا انسان وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے، یہ ہم آہنگ کا لفظ میں نے نہایت وسیع مفہوم میں لیا ہے یعنی وہ کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسکے وجود سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود بہرہ مند ہو۔ وہ جو خود اپنے اندر ہمت رکھتا ہو اسکو کسی دوسرے کے احسان و کرم کی ضرورت نہیں ہوتی۔"
(ذاکر حسین)

یہ علی گڑھ ہے

(محمد آصف نسیم عثمانی)

آج میں علی گڑھ کے ایک عجیب و غریب گروہ کو آپ سے متعارف کرانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ طبقہ (جس کیلئے مخلوق سے زیادہ اچھا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا) عرفِ عام میں ریسرچ اسکالر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریسرچ اسکالر ہونیکا اہل ہر شخص ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں۔ ہمارے یہاں طالب علم ہونا جسکی قسمت میں لکھا ہے اسکی قسمت میں ریسرچ اسکالر ہونا بھی لکھا ہے۔ اور تلاش روزگار کی آندھیوں کے جھکڑوں سے براہ راست واسطہ پڑتا ہے۔ کوئی ایم اے کرنے کے بعد یکایک ایک قسم کا بریک لگتا ہے اور پناہ گاہ تو نظر آتی نہیں لہٰذا ریسرچ اسکالر تو ہو گئے یعنی دم لینے کو ٹھہر گئے "اور ذرا چلیں گے دم لیکر"۔ ریسرچ اسکالر ہونیکے بعد غمِ امتحان اور غمِ روزگار سے تو چھٹکارا مل ہی جاتا ہے۔ ذرا بات بھی بن جاتی ہے۔

ریسرچ اسکالر کے کام کے بارے میں باخبر حلقوں میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اسکا کام تحقیق کرنا ہے، بعض کا خیال ہے اسکا کام تحقیق کرنے کیلئے فضا پیدا کرنا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ اسکا کام یہ ہے کہ وہ موضوع کے بجائے "ڈائرکٹر صاحب" پر تحقیق کرے۔ ایسے ریسرچ اسکالر اپنے ڈائرکٹر کی بیویوں، بچوں اور کتوں کی ایک فہرست بناتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کون بچہ کا منگیتر یا برسر روزگار ہے۔ وہ ڈائرکٹر صاحب کی نشست و برخاست، عادات و اطوار اور گفتنی و ناگفتنی تمام کاموں سے باخبر رہتے ہیں۔ اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو سمجھتے ہیں تھیسس مکمل ہو گئی۔ ڈاکٹر ہونا یا نہ ہونا تو اللہ کے اختیار میں ہے اور اللہ بڑا بخشش کرنیوالا مہربان ہے۔ ریسرچ اسکالر سے کسی وقت بھی ملئے وہ یا تو لائبریری میں بیٹھا گپیں مارتا نظر آئے گا یا ڈائرکٹر کی بے اعتنائیوں کا رونا روتا ہوگا۔ دل میں لیکچرر بننے کا خیال ہر وقت ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے۔ اور وہ سب کام اسی نیت سے کرتا ہے۔ ریسرچ اسکالری لیکچرر ہونے کا ایک شارٹ کٹ ہے جس میں تھیسس لکھنے کے بجائے ٹریننگ کی جاتی ہے اور پڑھنے لکھنے کے بجائے یونیورسٹی کے مربی اور دوسرے حلقوں میں پروپیگنڈا کیا اور کرایا جاتا ہے۔

جب عالم یہ ہے تو پھر کہاں کا لکھنا اور کیسا پڑھنا؟

یوں ریسرچ اسکالر کو کبھی فرصت میں بھی نہیں دیکھا گیا۔ زیب داستان کے لئے اخبارات خریدیگا، اور ان کے کٹنگ کے گھر کے گھر بنائے گا، بغل میں ایک دو نہیں دس بیس کتابیں لیکر نکلے گا، آگرہ، دہلی اور ہاتھرس کی تمام ہائی سیکنڈری، بک اسٹال اور ٹرکیں چھان مارے گا لیکن Material یعنی مواد تو شاعری کی ہما ہے جس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔ ریسرچ اسکالر کی ایک شان یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ پڑھتا کم ہے، سوچتا زیادہ ہے اور اصل میں سوچنا ہی بڑے بڑے نکات پیدا کرتا ہے لیکن اظہار خیال مناسب نہیں سمجھتا۔ اظہار خیال ہو گیا تو بات ادھ کچل نہیں رہتی۔ آخر نے ایک شعر کہا تھا جس میں غلطی سے زندگی کی جگہ عشق استعمال ہو گیا

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں

دراصل ریسرچ اسکالر کو اپنی عمر کے رائیگاں جانے کا کوئی احساس ہونا ہی نہیں چاہئے۔ جہاں یہ احساس پیدا ہوا سمجھئے جذبہ صادق نہیں۔ اور پھر یہ تو اقتضائے پیشہ بھی ہے۔ ریسرچ اسکالر لگنے ... بلکہ ہر جگہ سُر غزل ہے (بقیہ صفحہ ۵ کالم ۲ پر)

دعوت فکر

(محمد حنیف اعظمی)

۳۰ر دسمبر کو یونین میں ان طالب علموں کا خیر مقدم کیا گیا جو ابھی حال میں یونیورسٹی سے نکالے گئے تھے۔ اس سلسلے میں میری جن لوگوں سے بات ہوئی ان میں سے کافی تعداد اس خیر مقدم کو نہ صرف غیر ضروری سمجھتی تھی بلکہ نامناسب بھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس جلسے کے منعقد کرنے کا مقصد خیر مقدم سے زیادہ کچھ اور ہوگا مثلاً اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پچھلے چند مہینوں میں جو صورت حالات پیدا ہوئی تھی اس کا اچھے انداز میں جائزہ لیا جائیگا اور یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ احتجاج کے موقع پر ہم سے جو غلطیاں ہوئیں ان کا تجزیہ کیا جائیگا اور وضاحت کے ساتھ بتلایا جائیگا کہ اگر خدانخواستہ پھر کبھی اس قسم کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو اس موقع پر یونین کے عہدہ داروں کا کیا رویہ ہونا چاہئے اور عام طلبہ کیا طرز عمل اختیار کریں۔ مگر جلسہ میں شرکت کرنے کے بعد مایوسی ہوئی۔ نہ تو پہلی بات ہوئی اور نہ دوسری۔ تمام تقریریں سننے کے بعد میرے پر دو تاثر ہوئے۔ ایک تو یہ کہ اس جلسے کا بڑا مقصد کچھ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ دوسرا یہ کہ یا تو کچھ باتیں ہم کہنا چاہتے ہیں مگر کھل کر کہہ نہیں سکتے یا یہ کہ پچھلے دنوں جو واقعات رونما ہوئے ان کے بارے میں ہمارا ذہن پوری طرح صاف نہیں ہے۔ مثلاً عام طور پر دو باتیں ایک ہی سانس میں کہی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے کچھ غلطیاں کیں، دوسری یہ کہ اگر پھر کبھی ہمارے مذہب اور ملت، پیشوا پر حملہ ہوا تو ہم احتجاج ضرور کریں گے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلی بات مصلحتاً کہی جاتی ہے اور دوسری بات شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو ان دونوں باتوں کو بہت وضاحت کے ساتھ الگ الگ بیان کرنا چاہئے۔ مثلاً تفصیل سے یہ بتلانا چاہئے کہ ہم نے کیا کیا غلطیاں کیں اور کیوں کیں، اور یہ کہ آئندہ اگر کوئی موقع آیا تو ہمارے احتجاج کی کیا نوعیت ہوگی تاکہ ہم اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ جب تک ہم ان غلطیوں کا سراغ نہ لگائینگے اس وقت تک محض اعتراف کر لینا آئندہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہوگا۔

میرے نزدیک ہم نے پہلی اور اہم ترین غلطی یہ کی ہے کہ احتجاجی جلسہ کا اعلان کرنے سے قبل واقعہ کی پوری طرح چھان بین نہیں کی۔ ایک سستے سے اخبار نے جو کچھ لکھ دیا اسکی جانچ کئے بغیر من و عن صحیح مان لیا اور اساتذہ یا یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے مشورہ کئے بغیر یونین کا ایک غیر معمولی جلسہ طلب کر لیا۔ جن لوگوں پر الزامات لگائے گئے تھے نہ تو ہم نے ان کے وضاحتی بیان کا انتظار کیا اور نہ انکو لکھکر صحیح صورت حال معلوم کی۔ پھر جلسہ سے قبل ہم نے تفصیلات طے نہیں کیں۔ ہم جس مسئلہ پر احتجاج کرنے جا رہے تھے اسکا تعلق جذبات سے زیادہ تھا۔ اسلئے مصلحت اور تدبر کا تقاضا تھا کہ تمام پہلوؤں پر غور کر لیا جاتا مثلاً مقررین کی فہرست تیار کی جاتی اور ان سے گفتگو کر لی جاتی کہ وہ غیر متعلق باتیں نہ کہیں گے اور یہ کہ کسی حالت میں متانت اور سنجیدگی کا دامن نہ چھوڑینگے۔ نیز غیر مناسب باتیں روکنے کیلئے اور نظم و ضبط قائم رکھنے کیلئے پہلے سے کیا تدبیر اختیار کرنی چاہئے تھی۔ چوتھی غلطی یہ ہے کہ جلوس کسی حالت میں بھی نہیں نکالنا چاہئے تھا۔ ان تمام غلطیوں کی وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ ہم نے یونین کی آزادی کے بارے میں اپنے ذہن میں غلط تصورات قائم رکھے ہیں۔ یونین کے معاملات میں ہم اپنے اساتذہ سے مشورہ لینے کو قائل نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یونین اور اساتذہ کے درمیان یہ جو دیوار کھڑی ہے وہ جس قدر جلد مسمار کر دی جائے، اچھا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۵ کالم ۱ پر)

مونس صاحب



مونس رضا ـــــ یہ ایک نام ہے جس کا ذکر آتے ہی ذہن میں ایک ایسا نقش اُبھرنے لگتا ہے جو مروت کا پیکر اور حسنِ اخلاق کی جیتی جاگتی تصویر ہے جنکی ذات محبت، صداقت پسندی اور شریف النفسی کا ایک حسین امتزاج ہے جسمیں بغیر تعلّی اور تصنع برائے نام بھی نہیں۔

مونس صاحب ایک یار باش آدمی ہیں۔ استادوں میں استاد اور لڑکوں میں لڑکے۔ ان کی دوستی کے لیے ذوق، عمر اور مزاج کی کوئی قید نہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر ماحول میں کھپ سکتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ گھنٹوں ایسی باتیں کرتے ہیں گویا ان کا ایک چہیتا دوست ہے جسکے استاد ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے انکی استادانہ عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اور اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے دوستوں میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے لوگ ہیں ـــــ اسکولوں کے اساتذہ، کالج کے لیکچرار اور پروفیسر، کلرک، مزدور، سیاسی ورکر، کلاکار، ادیب، کھلاڑی، طلباء ـــــ وہ سب سے ایک ہی طرح ملتے ہیں اور سب ان پر جان چھڑکتے ہیں۔

مونس صاحب کو کبھی کسی نے افسردہ نہیں دیکھا۔ کوئی غم، کوئی خلش اور کوئی دشواری انکی مسکراہٹ نہیں چھین سکتی۔ انکے ہنستے ہوئے چہرے پر دو نازک نازک ہونٹ ہیں جو صرف مسکرانا جانتے ہیں صرف چہکنا جانتے ہیں۔ غمِ روزگار کا شکوہ اور گلہ ان کے مذہب میں حرام ہے۔ لیکن غموں کو پینے اور مسلسل پیتے رہنے نے انھیں ایک روگ ضرور لگا دیا ہے۔

مونس صاحب علی گڑھ کی تہذیبی زندگی کی روحِ رواں ہیں۔ انجمن آرائی کا انھیں بڑا شوق ہے اور دراصل انکی زندگی تمام تر اس سے بھرپور ہے۔ وہ ان سرمست رندوں میں سے ہیں جو جہاں جھوم کے بیٹھ جائیں میخانہ بن جائے! ذوق و شوق اور رنگارنگ بزم آرائیوں کا سلیقہ انکے ہر ہر کام میں جھلکتا ہے۔ کام کو انھوں نے فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ فنِ لطیف جس میں فنکار اپنے خلوصِ نیت اور خونِ جگر کی آمیزش کرتا ہے۔ اور یہ بات اگر ہم سب میں آ جائے تو کسی آسمانی جنت کی تمنا باقی نہ رہے۔ مونس صاحب شعبۂ جغرافیہ میں ایک لیکچرر ہیں۔ وہ علم کے اس میدان میں کوئی درجۂ استناد تو نہیں رکھتے، ایک کامیاب استاد ضرور ہیں جس پر بڑے بڑے علامہ رشک کرتے ہیں۔ انکی شخصیت شعبۂ جغرافیہ کی تمام رعنائیوں کی جنم داتا ہے۔ یہاں کی چہل پہل، آرزوئیں اور ولولے، عشق و مقصد سب انکی ذات کے گرد گھومتے ہیں۔ کوئی قابلِ ذکر پروگرام مونس صاحب سے بے نیاز رہکر کامیاب نہیں ہو سکا۔ آج جب وہ بیمار ہو کر شعبہ سے علیحدہ ہو گئے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کوئی جانِ انجمن نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ انکی عدم موجودگی نے شعبہ کی ساری زندگی کو افسردہ اور بے جان بنا دیا ہے۔ مونس صاحب سے فضا ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کے کردار میں کچھ ایسی بات ہے جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔ کوئی شخص ان سے مل کر اپنے آپکو انکی محبت سے نہیں بچا سکتا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں ـــــ انکی محبت وہ محبت ہے جو انسان اور انسانیت کی عظمت سے آگاہ کرتی ہے، خلوص اور خدمت پر ابھارتی ہے، عظیم کارناموں کو سرانجام دینے کا سبب بنتی ہے ـــــ انھیں دیکھکر اور ان سے مل کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پیار کے لئے بنی ہے، نفرت اور عداوت کیلئے نہیں۔ علی گڑھ میں طلباء کا کوئی حلقہ ایسا نہیں جہاں وہ مقبول نہ ہوں، جہاں انکی پرستش نہ ہوتی ہو، جہاں لوگ انھیں "مونس بھائی" نہ کہتے ہوں۔ انھوں نے سب کے دلوں کو فتح کر لیا ہے۔ اور ان سے حسبِ منشا کام لیا ہے۔ لیکن آج فاتح خود مضمحل و مجروح ہے۔ آج اسکی قوتِ ارادی خود شل ہو گئی ہے۔ آج وہ خود اداس و غمزدہ ہیں۔

مونس صاحب نے انسانیت سے محبت کی تھی۔ دنیا سے برائیوں اور مظالم کو مٹانے کی انتھک جدوجہد کی تھی۔ وہ اس سسکتی اور تڑپتی ہوئی دنیا کو زندگی کی رعنائیوں سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کشمکش میں خود زندگی ان سے چال کھیل گئی۔ انھوں نے محبت کی، انھوں نے عشق کی تب و تاب سے جوانوں کے لہو کو گرمایا، لیکن جب خود اپنی محبت کا دیپ جلانا چاہا، اپنی جوانی کی ہلکی امنگ کو سجانا چاہا، تو عورت دیر بریت کا وہ دیوتا جسکے استقبال میں انھوں نے زندگی کی بازی لگا دی تھی یہ سب کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس نے انھیں ایک ایسی بیماری لگا دی جس نے ان کے عشق، انکی زندگی، انکی خدمت اور انکی مسرت کے محدود خزانے سے جو کھیل شروع کر دیا ہے، کون جانے اس جوئے میں کسکی جیت ہو ـــــ ہم کانپور کے مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں، چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور معصوم آرزوؤں کیلئے لڑنے والا جانباز سپاہی، انسانیت کی بہبود چاہنے والا، احترامِ انسان، علم کے کام کو مقدس روحانیت عطا کرنے والا شفیق استاد آج ہسپتال کے ایک گوشۂ تنہائی میں سکون و اطمینان تلاش کر رہا ہے۔ وہ آج زندگی کی تمام رعنائیوں سے دور بیماری کے قوی ہیکل دیو سے مصروفِ پیکار ہے۔ اور ہم یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لڑائی میں ہم اسکی کوئی مدد نہیں کر سکتے، ہم اس کا درد بانٹ نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں یقین ہے وہ بہت بہادر سپاہی ہے اور وہ یقیناً فتحمند ہو گا اور ہماری اس انجمن میں ضرور واپس آئے گا ـــــ خلوص اور محبت سکھانے کیلئے، مصائب سے کبھی نہ ہارنے کیلئے اور انسانیت کی پرستش کرنے کے لئے وہ ضرور واپس آئے گا ـــــ!

بہ سپیسلہ درن

یونیورسٹی لائبریری کی نئی عمارت!

۱۷ دسمبر کو ڈپٹی حبیب اللہ صاحب کے مبارک ہاتھوں سے لائبریری کے لئے بننے والی نئی عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ لائبریری کی عمارت کے لئے ۱۹۵۴ء میں ذاکر صاحب کی کوششوں کی بدولت حکومت ہند سے ۱۰ لاکھ کی گرانٹ منظور ہوئی تھی۔ لائبریری کا نقشہ ہندوستان کے مشہور ماہر تعمیرات جناب فیاض الدین صاحب نے تیار کیا، اور عمارت کا سنگ بنیاد پچھلے سال نومبر میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں رکھا گیا۔

اس مجوزہ عمارت میں ۵ لاکھ کتابوں کا اسٹاک آسانی سے سما سکیگا جس میں کئی ریڈنگ روم ہوں گے، ریسرچ اسکالرز کے لئے متعدد علیحدہ علیحدہ کمرے ہونگے۔ ایک کمرہ اخبار و رسائل کے لئے وقف ہوگا۔ ایک بڑا حصہ صرف مخطوطات کے لئے ہوگا اور ان سب کے ساتھ ایک بہت نفیس قسم کا Cafeteria بھی ہوگا۔ یہ پوری عمارت Air - Conditioned ہوگی۔ زیدی صاحب نے یقین دلایا ہے کہ لائبریری کی یہ شاندار عمارت ستمبر تک بنکر تیار ہو جائیگی۔ اس سلسلہ میں ہم ذاکر صاحب اور زیدی صاحب کے تو ممنون ہیں ہی، ساتھ ہی ———— نئے یونیورسٹی انجینیر عبد الجبار خاں صاحب کے تقرر کے بعد سے بلڈنگ ڈیپارٹمنٹ جس مستعدی اور تندہی سے یونیورسٹی کے تمام تعمیری کاموں میں دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے وہ قابل ذکر بھی ہے اور قابل مبارکباد بھی۔

● یونیورسٹی لائبریرین نے ۲۱ دسمبر سے General Knowledge Tests کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں وہ کامیاب طلباء کو گولڈ میڈل اور Stipends وغیرہ دینگے۔ یونیورسٹی لائبریری میں اس سال غیر معمولی طور پر زندگی کے بڑے آثار نظر آرہے ہیں۔

یونین میں

● ۲۰ دسمبر کو "واپس بلائے ہوئے طلباء" کو یونین کی طرف سے "خوش آمدید" کہا گیا۔ اس موقع پر بشیر محمد خاں اور اقتدار عالم خاں نے تقریریں کیں جس میں بعض غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کا شکریہ ادا کیا۔

● ۲۰ کی شام کو کل ہند انگریزی ڈبیٹ ہوئی جس کا موضوع تھا "Moral Progress is Prior to Economic —— development"

باہر سے صرف تین ٹیموں نے شرکت کی، آرٹس کالج پٹنہ، ڈی اے وی کالج کانپور اور دہلی کالج دہلی۔ اس طرح مباحثہ میں صرف مقرروں نے حصہ لیا مجموعی حیثیت سے تقریروں کا معیار بہت اچھا رہا۔ پہلا انعام دہلی کالج کے مسٹر دکشت نے حاصل کیا، دوسرا انعام بھی دہلی کالج کے دوسرے مقرر مسٹر سندرم کو ملا، اور تیسرا (کانپور) ڈی اے وی کالج کے مسٹر شکلا کو۔ شردہ دہلی کالج دہلی کو گئی۔ ٹیم نے کوئی انعام حاصل نہیں کیا۔ تاہم اسکے مقرروں کا معیار کافی اچھا تھا ● اردو ڈبیٹ میں ٹرافی میرٹھ والوں کو گئی۔

تہذیبی رفتار

ایس۔ ایس۔ ہال

پچھلے ہفتہ علی گڑھ میں بڑی ہما ہمی رہی۔ ۱۷ دسمبر کو ایس ایس ہال ڈرامٹک کلب کی طرف سے اسٹریچی ہال میں "شام موسیقی" منائی گئی اور ۲۳ دسمبر کی شام کو کلب کے زیر اہتمام "اردو تھیٹر" علی گڑھ نے ڈاکٹر محمد حسن کا تمثیل "ریہرسل" پیش کیا۔ شام موسیقی خلاف توقع پھیکی گزری۔ موسیقاروں اور گانے والوں کی تعداد کم تھی اور سننے والے بھی بڑی قلیل تعداد میں تھے۔

۲۳ دسمبر کے پروگرام کا آغاز رفعت حسین کی مختصر لیکن بے موقع تقریر سے ہوا جس میں انھوں نے ڈرامے کے فن پر اپنی رائے پیش کی۔ اسکے بعد موسیقی کی جھنکار کے ساتھ پردہ اٹھا اور ریہرسل شروع ہوا۔ جو لوگ ڈرامہ میں کوئی اہم سماجی پہلو یا مقصد ڈھونڈنے گئے ہونگے انھیں یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی لیکن سامعین کے ایک بہت بڑے طبقے نے ڈرامے کے مزاح اور قہقہوں میں چھپے ہوئے مقصد کو سمجھا اور پسند کیا۔ اس میں رفیق تازی (لنجانی) اور اسکے باپ (افتخار) کا رول بہت پسند کیا گیا۔ ڈائرکٹر (　　) کی پریشانیوں اور امجد شاہد (قمر رئیس) کی حرکتوں پر سب سے زیادہ داد ملی۔

یوم مجاز

۲۴ دسمبر کی اواس شام کی نوعیت کچھ دوسری تھی۔ "یوم مجاز" کے سلسلے میں مجاز میموریل کمیٹی کی طرف سے یونین ہال میں ایک کامیاب نمائش منعقد کی گئی جس میں مجاز سے متعلق تصویریں وغیرہ رکھی گئیں۔ اسکے بعد دن ڈھلتے ہی ایک سمپوزیم منعقد کیا گیا جس کا آغاز علی گڑھ ترانے سے ہوا۔ سمپوزیم میں حمیدہ سالم، شہاب جعفری، اور قمر رئیس وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ اشتیاق محمد خاں اور انکے ساتھیوں نے مجاز کی غزلیں وغیرہ ترنم سے پیش کیں اور آل احمد سرور اور ڈاکٹر علیم نے تقریریں کیں۔ مجاز کی بہن حمیدہ سالم کا رقت آمیز مقالہ سن کر لوگوں کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور ڈاکٹر علیم نے جب شاعر شہر نگار کی محرومیوں کا تذکرہ کیا تو بہتیری نمناک پلکوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ۵ دسمبر کی شام بھی مجاز کی یاد میں گزری اور ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس میں خلیل اعظمی، آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین، ڈاکٹر حبیب الرحمن، قمر رئیس، شہاب جعفری، اور معظم، امین اشرف اور عمران انصاری وغیرہ نے شرکت کی۔ اعظمی صاحب کی غزل "کفر آیا، ترے رندوں کو نہ اسلام آیا" اور قمر رئیس کی نظم "قریب" خاص طور پر پسند کی گئی۔ اتفاق سے مشاعرہ میں کوئی بھی بیرونی شاعر نہ تھا اور مقامی شاعروں نے بیشتر پرانی چیزیں سنائیں۔ سرور صاحب کی ایک چھوٹی سی اختتامیہ تقریر کے بعد یہ ہنگامی شام بھی گزر گئی۔

بزم علیگ کا مشاعرہ

● ۱۶ دسمبر کی رات کو بزم علیگ کے زیر اہتمام آفتاب ہوسٹل میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں حضرت حامد الہ آبادی، احسن نشاط گورکھپوری، اقبال رامپوری، احمد اسحاق نجانی، محمد خاں درانی، نوفان ادیب، اقتدار ندوی، حضرت شمس اور پرنسپل احسن صدیقی نے اپنا کلام سنایا۔ حسام الدین فاروقی (صدر مشاعرہ) کے صدارتی خطبہ کے بعد ۱۲ بجے کے قریب شمع مشاعرہ گل کر دی گئی۔

● ۱۹ دسمبر کو شری گوبند سہائے نے یونیورسٹی یوتھ سمان کا افتتاح کیا۔ اسکے کنوینر مسٹر سنگھل اور سکریٹری مسٹر شفیع الرحمن ہیں۔

آزاد ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی کا مقام

(صدیق الرحمٰن قدوائی ایم۔اے پریویس (سیاسیات))

ہمارا یہ ادارہ کچھ مخصوص حالات میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حالات بدلتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس ادارہ کا رول بھی ملک وملت کی زندگی میں بدلتا رہا۔ اس وقت اس سے سروکار نہیں ہے کہ اس نے کب صحیح رول ادا کیا اور کہاں کہاں لغزشیں ہوئیں۔ بلکہ اب ہمیں اس کی نوعیت کو متعین کرنا ہے اور یہ طے کرنا ہے کہ حال و مستقبل میں اس ادارہ کا کیا رول رہے گا۔ اسکے لئے ہمیں اس پس منظر پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ہوگی جس میں یہ ادارہ پلا بڑھا ہے اور جسکے اثرات اس کی نس نس میں سما چکے ہیں۔

ہندوستان کی تہذیب اس ندی کی مانند ہے جو مختلف دھاروں کے یکجا ہونے پر وجود میں آئی ہو اور تمام دھارے اپنا اپنا رنگ قائم رکھتے ہوئے بھی ایک ہی سمت رواں ہوں۔ ماضی میں اس ندی کی رفتار بہت دھیمی رہی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ہمارے بیرونی ناخداؤں نے اسکے رخ کو اس طرح پھیرنا چاہا کہ تمام دھارے مختلف سمتوں میں بہہ نکلیں اور اس دھیمی ندی میں طغیانیوں اور جولانیوں کے امکانات سرے ہی سے ختم ہو جائیں ورنہ اس کی موجیں کسی لمحے بھی خطرناک توانائی حاصل کر کے بڑے سے بڑے بندھ میں شگاف پیدا کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔ موجیں اسقدر خوابیدہ تھیں کہ وہ رقص کرنا بھول گئیں ورنہ کسی وقت بھی وہ ان ناخداؤں کو غرقاب کرنے کے لئے گرداب کی شکل اختیار کر سکتی تھیں۔

جب دھارے الگ الگ سمتوں میں بہہ نکلے تو ان کو اپنی ناتوانی کا احساس ہوا۔ یہ احساس رفتہ رفتہ ایک اضطراب کی صورت اختیار کر گیا اور بالآخر تحریک بچھڑے ہوئے دھاروں کو ایک بار پھر قریب لے آئی۔ مگر اب بھی کچھ موجیں بہاؤ کے خلاف جانے پر مائل تھیں۔ یہ موجیں مچلتی رہیں اچھلتی رہیں اور آج تک ایک ہیجان برپا کئے ہوئے ہیں۔ تاہم اب یہ بات یقینی ہے کہ یہ چند سرکش موجیں اس تند و تیز ندی کا رخ پھیرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں اور وقت کی رفتار انھیں بھی رفتہ رفتہ اس تند خرام ندی میں مدغم کر دے گی۔

مسلم یونیورسٹی دراصل اس ندی کے ایک باوقار اور پرغرور دھارے کی ایک طاقتور اور اخلاقی جوش موج ہے اور اس کا وجود بھی جائز قرار دیا جا سکتا ہے جب وہ اس دھارے کی تیز لہروں کو کس بل دے۔ انھیں تڑپنے اور رقص کرنے کے آداب سکھائے اور انھیں ایک ایسی توانائی دے جو اس عظیم ندی کی رفتار کو تیز تر کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

یہ یونیورسٹی مسلمانوں کا ایک ادارہ رہی ہے اور اسے آئندہ بھی مسلمانوں کا ہی ادارہ رہنا ہے۔ مگر اس کی حیثیت اس ملک میں یقیناً وہ نہیں ہو گی جو آزادی سے پہلے ایک عرصہ تک رہ چکی ہے۔ اس ادارہ کا قیام جن حالات میں ہوا تھا کچھ ویسے ہی حالات آج بھی پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک پرانے معاشی، سماجی اور سیاسی نظام کے بطن سے ایک نیا نظام جنم لے رہا تھا اور اس وقت بھی ملک کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں عظیم الشان تغیرات نظر آرہے ہیں۔ اس وقت کی تبدیلیوں میں بھی مسلمان چند مخصوص وجوہ کی بنا پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہراساں اور پریشان نظر آتے تھے اور آج بھی تقریباً اسی قسم کی کیفیات ان پر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اس ادارہ نے اس دور میں ایک نئے باب کا آغاز کیا تھا تو آج بھی یہ ادارہ یقیناً علمی و ملی زندگی میں اہم تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی اپنے قیام کے وقت سے لیکر اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی مرکز رہی ہے اور اس وقت بھی یہ اپنی مخصوص حیثیت کی بنا پر مسلمانوں کی زندگی اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں بہت اہم اور مفید کام انجام دے سکتی ہے۔ یہ یونیورسٹی ہندوستان کی سیاست سے ہمیشہ متاثر رہی ہے اور اس نے اپنی مرکزی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے تربیت یافتہ نوجوانوں کے ذریعہ ملک کے مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی تنظیم میں معاونت اور رہنمائی بھی کی ہے۔ چنانچہ کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ زندگی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس ادارہ کو کسی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریہ سے منسلک رہنا چاہئے۔ سچ پوچھئے تو یہی وہ کمزوری تھی جسکے سبب اس یونیورسٹی کی پچھلی تاریخ میں بعض بہت سخت مقامات آچکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ حقائق سے ناآشنا حضرات اس یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والوں کو آج بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انکی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انکی لغزشوں کو عجیب و غریب رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ہم سب کی متحدہ کوشش ہونی چاہئے کہ اس یونیورسٹی میں مختلف سیاسی خیالات، سماجی نظریات اور مذہبی عقائد سے تعلق رکھنے والوں کو نہ صرف یہاں پہنچنے کی اجازت ہو بلکہ ان کے لئے وہ تمام سہولتیں بھی بہم پہنچائی جا سکیں جن سے انھیں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملے۔ یہاں ایک ایسی فضا ہونا چاہئے جس میں وہ آزادانہ طور پر سانس لے سکیں، اپنے جذبات کا بہتر طور پر اظہار کر سکیں اور فکر و شعور کو پروان چڑھا سکیں۔

یہ ایک ہماری قومی کمزوری ہے اور ہم علی گڑھ والے تو خاص طور سے اسمیں مبتلا ہیں کہ ہم اپنی روایات کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں خواہ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھ چکا ہو۔ ہم ہر اس بات کو جو علی گڑھ سے صحیح یا غلط طور پر وابستہ کر دی گئی ہے پیار کرتے ہیں اور اپنے اس جنون پر فخر کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے قلب و ذہن کو گلشستان فکر و خیال بنانے کی بجائے انھیں صنم خانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم دن رات اپنے تراشے ہوئے اصنام خیالی کی پرستش میں گذار دیتے ہیں اور یہ دیکھنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتے کہ ان بتوں کے خط و خال کس قدر مسخ ہو گئے ہیں۔ انکی ملاحت اور کشش کتنی پھیکی اور ماند پڑ گئی ہے۔

اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس بت گری اور بت پرستی کے باوجود ہم بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں ایک انقلابی مذہب کا فرزند تصور کیا جائے ہمیں ایک زبردست سماجی تحریک کا علمبردار فرض کیا جائے۔ ہمیں سرسید کے چھوڑے ہوئے ورثہ کا حامل مانا جائے اور ہماری ہر بات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ انتہا تو یہ ہے کہ ہم نے سرسید کو بھی اپنے سامنے ایک بت بنا کر رکھ لیا ہے۔ ہم نے انکے اجتہاد، انکی ترقی پسندی، انکی اشک شوئی اور عرق ریزی کو اپنی نجات کیلئے کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم نے سال کا ایک دن انکی یاد کے لئے مخصوص کر لیا ہے، اور اس کے بعد انھیں پھر نقش و نگار طاق نسیاں میں شامل کر دیتے ہیں۔ سرسید کا پیغام اگر کچھ تھا تو یہ تھا کہ زمانے سے پیچھے رہنے کی بجائے ہمیں اسکی رہنمائی کرنی چاہئے۔ انکی شخصیت کا سارا وقار، انکی تحریروں کا سارا جادو، انکے افکار کی ساری بلندی اور انکے اعمال کی ساری قدر و قیمت محض اس بنا پر ہے کہ انھوں نے اپنی ہستی اس خیال کی تلقین و تبلیغ کے لئے فنا کر دی کہ ملک و ملت کو تنگ نظری کی تاریکیوں سے نکالا جانا چاہئے۔ ان کے ذہنوں میں وسعت اور دلوں میں کشادگی ہونا چاہئے۔ بار بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے والی قوم کو وہ نظر عطا ہو جو ظلمت امروز کو چیرتی ہوئی نکل جائے اور اس چشمہ حیواں تک جا پہنچے جو مستقبل کی آغوش میں پل رہا ہے۔ انکے سینوں میں تلاش و تجسس کی آرزوئیں ابل پڑیں، انکے ذہنوں سے فکر و احساس کے سوتے پھوٹ نکلیں، انکی نگاہوں میں وہ بیباکیاں مچلنے لگیں جو رازہائے حیات و اسرار کائنات کو بے نقاب دیکھ لیں۔ آج بھی مسلمانوں کو اور سارے ملک کو اس پیغام کی ضرورت ہے اور علی گڑھ کو ایک "پیام مجسم" بن کر سامنے آنا ہے۔ علی گڑھ کیلئے اس کا امکان اور بھی زیادہ ہے کہ اسکا خمیر انھی اجزا سے مرکب ہے۔ علی گڑھ انقلابات کا گہوارہ رہ چکا ہے یہاں کے نوجوانوں نے متعدد بار سارے ملک کو راہ حق دکھائی ہے۔ جہد آزادی کے خون زار کا وہ کون سا گوشہ ہے جہاں اس دشت جنوں کے دیوانوں نے اپنے لہو سے لالہ و گل نہیں کھلائے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں یہیں کے طلباء نے جہد آزادی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا تھا جو آگے چل کر بڑی بڑی معرکہ آرائیوں کا سبب بنا۔ کیا آج علی گڑھ ایک وضع جنوں ایجاد نہیں کر سکتا جس پر ہمارا ملک ناز کر سکے اور جس سے مستقبل فیض حاصل کر سکے۔ یقیناً ایسا ہو سکتا ہے بشرطیکہ تغیرات کو محسوس کیا جائے۔ روایات میں لچک پیدا کی جائے۔ ضرورت اور حالات کے مطابق نصب العین کا تعین کیا جائے اور اسی اعتبار سے طریقہ کار میں بھی تبدیلی ہو اور یونیورسٹی کے ماحول کی جمہوری بنیادوں پر تشکیل ہو۔

ہندوستان کو اس یونیورسٹی کی اسلئے ضرورت ہے کہ یہ ہندوستان کی اقلیتوں میں سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کا ادارہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ملک کے تمام مسائل سب کیلئے یکساں ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان مگر اسکے باوجود یہاں کے مسلمانوں کے چند مخصوص مسائل ہیں جن میں بعض بہت پہلے قائم ہیں اور بعض پچھلے چند برسوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کی چند مخصوص روایات ہیں جنکے تحفظ و بقا کی ذمہ داری کوئی دوسرا ادارہ نہیں لے سکتا۔ یہ سب مسائل اور روایات ہندوستانی مسلمانوں کی مخصوص سیاسی و تمدنی تاریخ سے منسلک ہیں۔ انکو حل کرنے کے لئے مخصوص طریقے اختیار کرنیکی ضرورت ہے اور اسکی راہ ایک ایسا ہی ادارہ نکال سکتا ہے جو ان کے قلب و ذہن کو متاثر کرنیکی قوت رکھتا ہو۔ اور جس کے اندر خود بھی مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو جذب کرنے اور ان سے ایک مطابقت قائم رکھنے کی صلاحیت ہو۔ آج مسلمان اجتماعی حیثیت سے اپنے چند مخصوص مسائل میں گرفتار ہیں۔ ان سے نجات دلانے کیلئے انکی رہنمائی کی ضرورت ہے اور یہ کام ایک ایسا ہی ادارہ انجام دے سکتا ہے جسکی ایک مرکزی نوعیت ہو جسکی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوں۔ جسکے پاس نہ صرف تجربات اور مشاہدات کے ذخیرے ہوں بلکہ مزید تجربات کے امکانات بھی موجود ہوں۔

یہ بات کہ یہ یونیورسٹی یہاں کے مسلمانوں کی زندگی میں کوئی اہم حصہ نہیں لے سکتی محض مایوسی، ناامیدی اور حالات کی تبدیلیوں کی رفتار کے غلط اندازے کی بنا پر کہی جاتی ہے یہ کہنا کہ مسلمانوں کی قسمت اب محض اکثریت کے ہاتھ میں ہے اور اس یونیورسٹی کی حیثیت اب محض نمائشی ہو سکتی ہے ہرگز صحیح نہیں۔ ایک سیکولر جمہوری حکومت میں اقلیت کی قسمت کو اکثریت کے ہاتھ میں تصور کر لینا بنیادی طور پر غلط ہے۔ مسلمانوں کی قسمت صرف ان کے اپنے ہاتھ میں ہے کسی حد تک اپنی قسمت کا فیصلہ وہ خود کرینگے، یہ ان کی دانشمندی، مصلحت بینی اور دور اندیشی پر منحصر ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ایک جیسے سماج میں سب فرقے ایک دوسرے پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ قومی ترقی میں سب کا حصہ ہوتا ہے اور اس کا پھل بھی سبھی کو ملتا ہے۔ اس یونیورسٹی کو قائم رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مشترکہ قومیت میں اقلیت اور اکثریت کے تناسب کو خود غرض عناصر اپنے مقصد کی خاطر استعمال کرنے کیلئے درہم برہم نہ کر سکیں اور اقلیت کو ان مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو اس ادارے کی عدم موجودگی میں بآسانی پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اقلیت میں اعتماد پیدا کرنے کیلئے اس ادارہ کا وجود اور استحکام بہت ضروری ہے۔ درحقیقت ایک وحدت کا سارا انتظام اسکے اجزاء کے استحکام اور باہمی اشتراک پر منحصر ہوتا ہے مسلمان اس قومی وحدت کا ایک لازمی جزو ہیں۔ اس وحدت کا سارا جلال و جمال، اسکا سارا نظم و استحکام اور اس کا سارا امتیاز اور وقار ایک کثرت پر منحصر ہے۔ جسکے بغیر اس وحدت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان ہمیشہ سے اس امتیازی خصوصیت کا حامل رہا ہے۔ اس دیس کا سارا رنگ روپ، اسکے چہرے کا سارا نکھار اور اسکے حسن کا سارا بانکپن اسی رنگا رنگ گنگا جمنی تہذیب میں پنہاں ہے یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ ہمیں اس پر بجا طور پر فخر ہے اور اسکو برقرار رکھنے میں ہمارا یہ ادارہ اس وحدت کے ایک اہم جزو سے متعلق ہونیکی بنا پر بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا بہت ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا مقصد مسلم نوجوانوں کو دوسرے فرقوں سے علیحدہ کرنا ہرگز نہیں ہے۔ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی پناہ گاہ نہیں بلکہ تمام فرقوں کا ایک سنگم ہے اور اس کیلئے یونیورسٹی میں طلباء کی زندگی اس دعوی کے ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اس یونیورسٹی کا مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو ملک کی تعمیر میں دوسروں کے دوش بدوش حصہ لینے کے لئے تیار کیا جائے۔ انکو اپنی صلاحیتوں کی تربیت

تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ

(از پروفیسر ڈیس)

(۵)

...... جون ۱۹۰۲ء میں طلباء کی تعداد ۷۰۲ تھی۔ جن میں ۴۹۶ بورڈر تھے۔ ۱۹۰۲-۰۳ء کا بجٹ جو ابھی زیر ترتیب ہے مجملاً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: (۱) میموریل فنڈ اور کالج وقف کے سرمائے کی آمدنی: ۲۰،۲۴ روپے (۲) سرکاری امداد ۱۵،۴۸ روپے (۳) ٹیوشن فیس ۲۵،۹۰۰ روپے (۴) ہاؤس پرابرٹی اور بورڈنگ ہاؤس کی آمدنی: ۱۲۳۰ روپے (۵) متفرق ۳۸۵۰ روپے ——— میزان ۹۷،۱۵۰ روپے ——— متحدہ ٹرسٹ فنڈ (سرمایہ امانت) ۱،۴۹،۰۰۰ روپے تھا۔ اس میں سے ۳۳،۰۶۶ روپے وظائف کے لئے امانت تھے۔ اس سال امانت میں لگنے والے سرمایہ کا تخمینہ ۳۰،۹۷۶ روپے لگایا گیا ہے، اس طرح کالج کا مجموعی سرمایہ ۴،۲۶،۹۵۹ روپے ہوا۔ اس کے علاوہ موجودہ کفایت شعاری کے بدولت کالج کے پاس ۲۹،۹۱۵ روپے مزید فلوٹنگ فنڈ میں تھا۔ ...... ۱۸۹۸ء میں ۳۳۳ طلباء کی نگرانی کیلئے جو اسٹاف تھا اسکی مجموعی تنخواہ ۵۰،۸۰۲ روپے تھی اور ۱۹۰۳ء میں ۴۰۰ طلباء کیلئے متعینہ اسٹاف پر صرف ۳،۵۰۰ روپے ترپیا ہوئے۔ ...... آج علی گڑھ کالج میں ہندوستان کے ہر صوبہ کا طالب علم ہے (برہا۔ بنگال۔ پورب۔ سورت۔ کراچی۔ پنجاب۔ سرحد۔ مدراس۔ میسور)۔ ...... اب علی گڑھ نہ صرف انھیں صوبوں بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز ہوگیا ہے ...... تمام ہندوستان کے گریجویٹوں کا تقریباً ½ حصہ ہر سال علی گڑھ سے نکلتا ہے۔ پچھلے سال کے ۱۱۱ مسلمان گریجویٹوں میں ۳۰ علی گڑھ کے تھے۔ ۱۸۹۲ ——— ۱۹۰۲ء کے درمیان ۸۷۴ مسلمان گریجویٹ ہوئے۔ ان میں ۱۱۷ علی گڑھ کے طلباء تھے۔

مسلمانان ہند کا علی گڑھ کو اپنا تعلیمی مرکز تسلیم کرلینا گزشتہ چند سالوں کی خاص چیز ہے اور میں اسے نواب محسن الملک اور ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں سے منسوب کرتا ہوں۔ ...... (پہلا اجلاس لاہور میں ہوا، دوسرا کلکتہ میں سید امیر علی کی صدارت میں، اور تیسرا جس کا انعقاد پٹنے میں ہونا طے پایا تھا رام پور میں ہوا ۱۹۰۲ء میں دہلی کو منتخب کیا گیا۔ اس کا صدر آغا خاں کو چنا گیا)۔ ...... کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد جس کے تحت محسن الملک نے اس کی تنظیم کی علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانا تھا۔ کلکتے میں امیر علی کا خطبۂ صدارت اور رام پور میں عماد الملک سید حسین بلگرامی کا خطبہ اسی کے گرد گھومتا ہے۔ آغا خاں کے طویل لیکن دلچسپ خطبہ میں بھی مسلمانوں سے پُرزور اپیل کی گئی (کہ ایک مسلم آکسفورڈ جنم دیا جائے اور اسکی مدد سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو پھر سے واپس کھینچ لیا جائے۔ انھوں نے قوم سے ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ چھ کروڑ مسلمانوں میں ایک کروڑ تو اس قابل ہونگے ہی کہ ایک ایک روپیہ دے سکیں)۔

مسلمان عوام کیلئے ایسی یونیورسٹی کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ......

ہمارے پاس جو دلائل ہیں وہ محض مسلم فرقے ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہندوؤں اور دوسرے لوگوں پر بھی بخوبی صادق آتے ہیں۔ ...... مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹی ایک فرقے کی ہو، ایک محدود رقبہ کی نہیں۔ ...... مسلم یونیورسٹی یا ہندو یونیورسٹی کی حمایت میں تعلیم کی ترقی کے پیش نظر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس طرح حقیقی معنی میں ایک یونیورسٹی ٹاؤن کی تخلیق ممکن ہوجائیگی۔ ایسے یونیورسٹی ٹاؤن جن کی کچھ اپنی مخصوص روایات ہونگی ...... علی گڑھ محمڈن کالج اور بنارس ہندو کالج اس بات کی شہادت ہیں کہ یہ تعلیمی مراکز مسلمان اور ہندو دونوں میں اتنی لگن پیدا کرسکتے ہیں کہ دور دراز کے فاصلے سے آکر ان میں تعلیم حاصل کی جائے ...... مسلم یا ہندو یونیورسٹی کیلئے میری دوسری دلیل کہ ایسے اداروں میں مذہبی تعلیم پر بھی باسانی زور دیا جاسکے گا۔ ...... میرا تو یہ خیال ہے کہ پڑھے لکھوں کی مذہب سے ناواقفیت، لامذہبیت سے زیادہ مہلک چیز ہے ...... (میں نے مسلمانوں میں مذہب سے یہ لاپرواہی دیکھی ہے ہندو پڑھے لکھوں میں ایسا ہی ہوگا۔ فرقہ واری یونیورسٹی اسے ختم کردے گی)۔ ......

میری تیسری دلیل ...... اتنا ہی مسلّم ہے، جو کلی جلی یونیورسٹی میں صحیح طریقے پر انجام نہیں پاسکتا ...... مجھے یقین ہے، اگر مسلمانوں کو یقین ہوجائے کہ حکومت انھیں چارٹر دیدیگی تو وہ جدوجہد کرکے مسلم یونیورسٹی کے لئے اتنا عطیہ دیدیں گے کہ سرکاری امداد کی ضرورت بھی نہ پیش آئے گی۔ لیکن حکومت علی گڑھ کو چارٹر دے یا نہ دے مسلمانان ہند کا فریضہ اور ان کا فائدہ بہ سید ھا سادا اس میں ہے کہ وہ ایم۔ اے۔ او کالج کی ترقی اور وسعت کی کوشش کریں، اس کو عمارتوں سے مزین کریں اور فیاضانہ عطیوں سے مالامال کردیں، یہاں تک کہ اسے ہندوستان کے سب سے بڑے ادارہ کی پوزیشن پر پہنچا دیں۔ ان کی کوششوں سے یہ کالج محمڈن یونیورسٹی ہو یا نہ ہو ایسا کالج جس کے پاس کافی روپیہ ہو، بہت سی لائبریریاں اور لیبوریٹریز ہوں، جسکی طرف مسلمان طلباء سارے ہندوستان سے کھنچے چلے آئیں۔ خود ایک الگ چھوٹی سی دنیا ہوجائے گا۔ یہ ایشیا میں مسلم کلچر کا مرکز اور اعلیٰ افکار اور اونچے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہوجائے گا۔ جو رفتہ رفتہ اسلامی دنیا کے بعید ترین گوشوں کو متاثر کرنے لگے گا۔

[پروفیسر ڈیس نے ۱۹۰۳ء تک کی مدرسۃ العلوم کی تاریخ بیان کرکے اپنا قلم روک لیا۔ یہ ایک ادارہ کی تاریخ تھی جیسے جو میں آنے اس وقت صرف ۲۸ سال گزرے تھے۔ اسکے بعد یہ ادارہ ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرگیا جس میں بہت سی لغزشیں بھی ہوئیں اور بہت سی اچھی روایات کی داغ بیل بھی پڑی۔ اس ادارہ نے کئی سیاسی تحریکوں کو پروان چڑھایا اور بالآخر دنیا کے نقشے پر ایک نئے ملک کو جنم دیا۔ اچھا تھا یا برا لیکن یہ اس ادارہ کی تاریخ تھی ۱۹۰۳ء کے بعد کی تاریخ کے لئے ہمیں دوسرے ماخذ کو تلاش کرنا پڑے]

(بقیہ صفحہ ۲ کالم ۲ سے)

میرے نزدیک طالب علموں کو غیر متعلق مسائل میں الجھنا ہی نہیں چاہیے۔ بجز [illegible] یہاں ان کا مقدم ترین فرض تعلیم حاصل کرنا ہے۔ اگر وہ اپنی انرجی کو غیر تعلیمی مسائل میں صرف کریں گے اور اپنے محدود وقت کی پوری پوری قدر نہ کریں گے تو اس کا نقصان نہ صرف انکی ذات کو پہنچے گا بلکہ قوم و ملک کو بھی پہنچے گا لیکن اگر آپ اس خیال سے متفق نہ ہوں اور اپنی محدود دنیا کے باہر کے مسائل میں عملی حصہ لینا ضروری سمجھتے ہیں اور [illegible] باتوں پر مظاہرے کرنا اور احتجاجی جلسے منعقد کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں تاہم [illegible] یہ بات تو آپ کو [illegible] کہ ایسے جلسے عملی [illegible] ہوں [illegible] احتجاج میں اور عوام کے احتجاج میں نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ [illegible] کا بلکہ [illegible] کا بھی۔ اگر ہم صرف یہی ایک فیصلہ کر لیں تو مجھے پوری امید ہے کہ آئندہ ہم کبھی ایسی غلطیاں نہ کریں گے جیسی پچھلی مرتبہ کر چکے ہیں۔

اس موقع پر اخبارات کے رویہ کی خاص طور پر شکایت کی گئی۔ یہ شکایت اس سے پہلے بھی کی گئی ہے۔ پچھلے سال کانگریس کے صدر شری ڈھیبر جب یونین میں تشریف لائے تھے تو ہمارے ایک طالب علم نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے بڑی معصومیت اور سادہ لوحی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ہماری کارروائیاں اخبارات شائع نہیں کرتے کیونکہ [illegible] کسی کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل پہلے اپنے متعلق غور کر لینا چاہیے جس طرح آپ کو بعض اخبارات سے شکایت ہے اسی طرح بہت سے لوگوں کو جن میں اخبارات بھی شامل ہیں آپ سے شکایت ہے۔ کیا آپ نے انکی شکایت کو دور کرنے کی کوشش کی؟ اگر انکی شکایت اصلیت پر مبنی نہیں ہے محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے تو کیا آپ نے کبھی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی سعی کی؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ابتک اسکی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ——— دوسری بات یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جب تک خود آپ اخبارات سے گہرا تعلق پیدا نہ کریں گے اسوقت تک انکی شکایت قائم رہیگی۔ پچھلے موقع پر جو کچھ ہوا اس سے ہم کو پورا پورا سبق لینا چاہیے اور آئندہ کے لئے اس سے بچئے اور تمام غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے اخبارات اور عوام دونوں سے گہرا ربط قائم کرنا چاہئے۔ محض خالی خولی تقریروں اور تجویزوں سے کچھ نہیں بلکہ ٹھوس عمل کے ذریعہ۔ کام ذرا مشکل ہے مگر بے کئے کو نہیں۔ اور اگر آپ واقعی اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ آپ یونین سے کہئے کہ اس مسئلہ پر ایک سمپوزیم منعقد کرے جس میں طلباء کے علاوہ اساتذہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

تبصرے

([illegible])

ماہنامہ "ساحل" فیروز آباد۔ (نومبر ۵۶ء)

ہمارے پیش نظر پہلے سال کا چھٹا شمارہ ہے۔ قسیم فیروز آبادی اس کے نگراں ہیں اور ادارہ جلال قریشی، غلام نبی شاد، شفیق رحمانی اور اقبال قمر دیوی پر مشتمل ہے۔ اوسط درجہ کا ادبی پرچہ ہے اور علم و ادب کی خدمت کے جس مبارک جذبہ کے تحت اسے چلایا جا رہا ہے وہ باعث تحسین ہے۔ فیروز آباد میں کوئی خاص صحافتی روایات قائم نہیں۔ آدھی صدی پہلے "ادیب" نکلا تھا۔ اسکے بعد ——— اب "ساحل" نکل آیا ہے۔ فیروز آباد سے ایک ادبی پرچہ کا اجراء معجزہ سے کم نہیں۔ لیکن خالص ادب سے کوئی کام چلتا نہیں آجتک ادیب اور شاعر وقت کی رفتار کو پہچان کر اسے نیا موڑ دینے کی مسلسل کوشش نہ کریں۔

کاروبار میں مصروف اس صنعتی شہر میں جو گنے چنے ادیب اور شاعر رہ جاتے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ آر۔ کے۔ آسمانی، رفیع الدین صاحب، محمد عظیم صاحب، یاور صاحب، حضرت اختر چنگیزی، حضرت نوشہ اکبری، نازکی صاحب اور خود "ساحل" کے مرتبین مل جل کر اس ماہنامہ کو ایک معیاری ادبی پرچہ بنا سکتے ہیں جو صحیح حیات آموز ادب کا نمائندہ بن جائے۔

"جدید سائنس" اردو کالج کراچی

جامعہ عثمانیہ کا بدل اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا ایک نیا کارنامہ کراچی کا اردو کالج ہے۔ جہاں سے اردو کے دو معیاری رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی رسالہ جو سہ ماہی ہے "برگ گل" کے نام سے نکلتا ہے اور سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے "جدید سائنس" کا اجراء ہوا ہے۔ اردو کالج کی ان مستحسن کوششوں کے لئے پوری اردو دنیا ممنون ہے۔

ماہنامہ "احسن" رام پور (نومبر ۱۹۵۶ء)

ابر گنوری کا جاری کیا ہوا یہ رسالہ جو رام پور سے انکے چلے آنے کے بعد دم توڑ چکا تھا احسن صاحب اور فروغ صاحب کی ادارت میں نئے عزم و ولولہ کے ساتھ نیا دور شروع کر چکا ہے۔ کئی شمارے نکل چکے ہیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ کسی مرکزی جگہ سے نہ نکلتے ہوئے بھی اس کا ادبی معیار پست نہیں۔ اسکے باوجود یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بہت سے ادبی رسالوں کی طرح اس میں بھی محض غزلیں نظمیں اور مقالے جمع کر دینا ہی تنہا مقصد معلوم ہوتا ہے۔ آج کے بحرانی دور میں جب تک ادب اس بحران کو حل کرنے میں مدد نہیں کرتا بیکار ہے۔ یہی وجہ ہے آجکل زیادہ تر ادبی پرچے بے جان نظر آتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۶ کالم ۱) غرض نہیں اور [illegible] ہے۔ چنانچہ کسی [illegible] لیا ہے کسی نے شاعری اور [illegible] شروع کر دی ہے۔ ایک صاحب نے [illegible] پال لی ہے تو دوسرے صاحب [illegible] مرغیوں، بطخوں، [illegible] اور کتوں کیلئے [illegible] کا بکس اور گوشت خریدتے ہیں اور [illegible] ہیں۔

ایم۔ اے۔ آر خاں اور عرفان اللہ نے ترتیب دیا ——— (مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں چھپکر دفتر علیگ ۲۲۸ آفتاب ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا)